© rasailojaraid.com

الفاظ میں حمایت کا اشارہ بھی دے دیا ہے۔

امریکا، ایران، عرب مالک، جس نے جو کچھ کیا، اب اس کے نتائج بھگت رہا ہے۔ تاریخ کی جو باگ قدرت کے ہاتھ میں ہے، وہ اس کا رخ موڑ رہی ہے۔ کوئی قدرت کے اشاروں کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ آگ اب پھیلے گی۔ سنی شیعہ تنازعہ عراق کو اپنی لپیٹ میں لے چکا۔ امارت اسلامیہ کے مقابلے میں ریاست شکست کھا چکی۔ آیت اللہ سیستانی نے ریاست کی حمایت میں اپنی ملیشیا کو تیار رہنے کا حکم دے دیا ہے، اس کے ساتھ مقتدیٰ الصدر نے بھی اپنی ملیشیا کو دوبارہ منظم کر لیا ہے تاہم وہ ریاست کے ساتھ نہیں ہیں۔ جب ریاست اس طرح خانہ جنگی کا شکار ہو جائے تو پھر اس کا منظم رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر عراق کی وحدت قائم نہیں رہتی تو یہ ممکن نہیں کہ شام، اردن، ایران اور ترکی براہ راست اس سے متاثر نہ ہوں۔ اسی طرح سعودی عرب بھی ہوگا اور پھر لازم ہے کہ پاکستان بھی ہو۔

اس ساری معرکہ آرائی میں امتِ مسلمہ کہیں نہیں ہے۔ نسلی عصبیتیں ہیں یا مسلکی۔ میں اسی لیے یہ عرض کرتا رہا ہوں کہ بحیثیت سیاسی تصور، امتِ مسلمہ ایک ایسا اسم ہے جس کا کوئی مسمیٰ نہیں۔ ایک روحانی وحدت کے طور پر وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ عراق کے موجودہ قضیے سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی ہے۔ دنیا بھر میں اسلامی تحریکوں نے اس تصور کو مجسم کرنی کوشش کی اور اپنی صفوں کی حد تک اس کا اہتمام بھی کیا جیسے پاکستان کی جماعت اسلامی یا مشرقِ وسطیٰ کی الاخوان المسلمون لیکن عملاً ہر جگہ نسلی یا مسلکی تقسیم ہی غالب رہی۔ اس میں اہلِ پاکستان کے لیے بڑا سبق ہے جہاں لوگوں کی وابستگی پاکستان کے جغرافیے سے زیادہ اپنے مسلک کے ساتھ ہے جن کی اساس مشرقِ وسطیٰ میں ہے۔ یہ وابستگی پہلے بھی یہاں ظہور کرتی رہی ہے اور ایک بار پھر کرے گی۔ سطحی مباحث اور تماشوں میں گھری قومی قیادت کیا اس کا ادراک رکھتی ہے؟ کیا قوم کو اس نئے چیلنج کے بارے میں خبردار کیا جا رہا ہے؟ کاش میں ان سوالات کے جواب اثبات میں دے سکتا۔

مسئلہ فلسطین

میرا مخاطب اسرائیل یا امریکا نہیں، اردو پڑھنے والے وہ لوگ ہیں جو فلسطینیوں پر روا رکھے گئے ظلم پر اداس ہیں۔

آج اہلِ فلسطین کے ساتھ ہمدردی کا تقاضا ہے کہ ان کے قتل عام کو رکوایا جائے۔ یہی نہیں، اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے کہ آئندہ ایسے واقعات کم سے کم ہوں۔ میرے نزدیک تشدد کی مکمل نفی کے سوا اس کی کوئی صورت نہیں۔ بدقسمتی سے پہلے الفتح اور اب حماس جیسی تنظیموں نے تشدد کو بطور حکمت عملی اختیار کر کے فلسطینیوں کو زخموں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ اس حکمتِ عملی سے مکمل آزادی تو دور کی بات، اب ادھوری آزادی کا تصور بھی خواب وخیال ہوتا جا رہا ہے۔ یاسر عرفات نے بعد از خرابی بسیار تشدد کو الوداع کہا۔ حماس کو ابھی تک تشدد پہ اصرار ہے۔ اس لائحہ عمل کی ناکامی نوشتہ دیوار ہے۔ فلسطینیوں کا بہتا لہو، تنہا ایسی دلیل ہے جو اس اندازِ فکر کی غلطی پر شاہد ہے۔ آج اہلِ فلسطین کو ایک نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ ایسی حکمت عملی جو ان کے جانی و مالی نقصان کو کم کر سکے اور مسئلے کے ایک منصفانہ حل کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے ان کی جدوجہد کو زندہ رکھ سکے۔ میری اس رائے کی بنیاد چند دلائل پر ہے:

۱۔ چند دنوں کے تصادم میں ۲۳۴ فلسطینی مارے جا چکے اور اس کے مقابلے میں صرف ایک اسرائیلی کی جان گئی ہے۔ اگر ہم ان واقعات کی ابتدا کو سامنے رکھیں تو تین اسرائیلی نوجوان اغوا کے بعد قتل ہوئے۔ یوں یہ دوسو چونتیس اور چار کی نسبت ہے۔ گویا ایک اسرائیلی کے بدلے میں اٹھاون فلسطینیوں کی جان گئی۔ ابھی جنگ جاری ہے اور نہیں معلوم کہ یہ نسبت کہاں تک جاتی ہے۔ اس سے پہلے، جب بھی تصادم ہوا، نسبت کم وبیش یہی رہی۔ ۹-۲۰۰۸ء میں بھی یہی ہوا تھا۔ اس وقت ۱۱۶۶ فلسطینیوں کے مقابلے میں تیرہ اسرئیلیوں کی جان گئی۔ تب یہ نسبت ایک اور نوے (۹۰) کی تھی۔ مجھے اس قیادت پر حیرت ہے جو اس حکمت عملی پر اصرار کرتی ہے جس میں انسانی جان کے ضیاع کا تناسب یہ ہے۔ اس قربانی کو بھی گوارا کیا جا سکتا ہے اگر یہ معلوم ہو کہ وہ مقصد پورا ہو رہا ہے جس کے لیے جانیں دی جا رہی ہیں۔ اس کا بھی دور دور تک کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔

۲۔ فلسطینی اس وقت کئی سیاسی وعسکری گروہوں میں منقسم ہیں۔ محمود عباس کی جماعت اور حماس کا اختلاف ظاہر وباہر ہے۔ یہ اختلاف نظری ہے اور مفاداتی بھی۔ برسرِ پیکار گروہ باہم قتل وغارت گری میں بہت سے لوگوں کی جان لے چکے۔ اس طرح منقسم قوم کسی منظّم ریاست کے خلاف کیسے لڑ سکتی ہے؟

۳۔ امتِ مسلمہ جس کو دن میں کئی بات پکارا جاتا ہے، کہیں موجود نہیں ہے۔ اس لیے اس پکار کا کوئی جواب نہیں آتا۔ مجھے حیرت ہے کہ لوگ اس کے باوجود خلا میں صدا لگاتے اور یہ امید کرتے ہیں کہ جواب آئے گا۔ میں بارہا عرض کر چکا کہ امت ایک روحانی وجود تو ہے کوئی سیاسی یا سماجی اکائی نہیں۔ آج مسلمانوں کی قومی ریاستیں ہیں یا مسلکی گروہ۔ سب اپنے اپنے مفادات کی آب یاری کر رہے ہیں۔ 'داعش' نے اپنے تئیں خلافت کا اعلان کیا اور القاعدہ نے اسے مسترد کر دیا۔ داعش کا اپنا خلیفہ ہے اور القاعدہ کا اپنا۔ امتِ مسلمہ پاکستان جیسے ملکوں میں بعض گروہوں کا رومان ہے۔ وہ فلسطینیوں کے لیے صرف احتجاج کر سکتے ہیں اور بس۔ کیا اس سے ان کے دکھوں میں کوئی کمی آ سکتی ہے؟

۴۔ اسرائیل ایک منظّم ریاست ہے اور اس کی پشت پر امریکا، برطانیہ اور روس جیسی کئی طاقت ور ریاستیں ہیں۔ یہ طاقتیں ہر اخلاقی اور بین الاقوامی قانون کو نظر انداز کرتے ہوئے اسرائیل کی حمایت کرتی ہیں۔ دنیا کا اس وقت اجماع ہے کہ اسرائیل کو بطور ریاست قائم رہنا ہے۔ فلسطینی ریاست کے بارے میں ابھی تک ابہام ہے۔ فلسطینیوں کی حمایت ایران کی ریاست کرتی ہے یا شام کی۔ اس حمایت کی اساس بھی نظریہ یا امت نہیں، ان ریاستوں کے علاقائی مفادات ہیں۔ اس وقت حماس کے ساتھ اسلامی جہاد کی تنظیم بھی موجود ہے جسے ایران کی حمایت حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسرائیل اور امریکا کو ایک تشویش یہ بھی ہے کہ حماس کی نسبت اسلامی جہاد سے معاملات کرنا مشکل تر ہوگا، اس لیے حماس سے معاملہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ شام کی حکومت اس وقت اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے، اس لیے فلسطینیوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ یوں بھی، بشار الاسد کے خانوادے کو امت مسلمہ سے جو نسبت ہے، اس کا حال کوئی اخوان سے پوچھے جن کی پیٹھ پر اس خاندان کا تازیانہ مسلسل برستا رہا۔ پھر یہ کہ ماضی میں بھی ان ریاستوں کی کوئی مدد فلسطینیوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے کام نہ آسکی۔ مصر میں اخوان ان کا اخلاقی اور کسی حد تک مادی سہارا تھے۔ ان کے بے چارگی ہمارے سامنے ہے۔

سادہ سا سوال ہے کہ ان اسباب کی روشنی میں اہلِ فلسطین کو کیا کرنا چاہیے؟ میرا خیال ہے کہ قابلِ عمل حل صرف ایک ہے۔ فلسطینی خود کو ایک سیاسی قیادت کے تحت منظّم کریں اور دو ریاستی حل کو قبول کرلیں۔ وہ اس بات کی پوری کوشش کریں کہ ان کی ریاست ہر طرح سے خودمختار اور آزاد ہو۔ اس کے ساتھ یروشلم کو ایک آزاد شہر قرار دینے کا مطالبہ کیا جائے کیونکہ یہ تینوں ابراہیمی مذاہب کے لیے تقدس رکھتا ہے۔ دو ریاستی حل پر اس وقت کم وبیش ساری دنیا متفق ہے۔ جب یہ فارمولا پہلی بار سامنے آیا تو اس میں فلسطینیوں کے لیے بہت کچھ تھا۔ جب انہوں نے اسے تسلیم نہیں کیا اور یہ خیال کیا کہ وہ عسکری جدو جہد سے اسرائیل کا خاتمہ کردیں گے تو ان اسباب کی بنا پر، جن کا میں نے ذکر کیا، ان کا وجود سمٹتا چلا گیا۔ آج اگر اسرائیل ۱۹۶۷ء سے پہلے کی سرحد کو تسلیم کرتے ہوئے مقبوضہ علاقے خالی کرتا اور ایک آزاد فلسطینی ریاست کو عملاً تسلیم کرتا ہے تو یہ فلسطینیوں کی بڑی فتح ہوگی۔

اگر تشدد کو خیر باد کہتے ہوئے، فلسطینی اس کے لیے سیاسی جدو جہد کرتے ہیں تو اس کے دو فوائد ان کو فوری طور پر مل سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسرائیلی تشدد میں کمی آجائے گی۔ دوسرا یہ کہ انہیں دنیا کے ایک بڑے حصے کی اخلاقی وسیاسی تائید میسر آجائے گی۔ اس وقت امریکا میں یہودیوں کی ایک بڑی تعداد ہے جو اسرائیل کے خلاف ہے۔ وہ اس ظلم کی تائید پر آمادہ نہیں۔ خود اسرائیل میں بھی بہت سے یہودی ہیں جو اسرائیل کو خوف کی اس فضا سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ مسلمان قومی راستیں بھی اپنے قومی مفادات کو قربان کیے بغیر، فلسطینیوں کی حمایت کرسکیں گی۔ اسرائیل آسانی کے ساتھ مقبوضہ علاقوں کو خالی نہیں کرے گا۔ اس کے لیے بھی طویل جدو جہد کی ضرورت ہوگی۔ تاہم اس وقت ساری توجہ فلسطینیوں کے قتل عام کو روکنے پر دی جانی چاہیے۔ کاش انہیں ایسی قیادت میسر آسکے جو ان کی بچوں کو زندگی کا پیغام دے سکے۔ پاکستان کی اسلامی تحریک اگر اہلِ فلسطین کو یہ مشورہ دے سکے تو ان کے ساتھ یہی حقیقی ہمدردی ہوگی۔ اب اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ حماس اور اسرائیل کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ ہو جائے۔ کیا ۲۳۴ ؍افراد کی جان اس لیے دی گئی؟ یہ سچ یہ کہ اسرائیل نے ظلم کیا لیکن سوال یہ ہے کہ فلسطینی قیادت نے اس ظلم کو روکنے کے لیے کیا کیا؟ اس وقت اہل فلسطین کو ایک نئی قیادت اور ایک نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ یہ طے کہ موت کو گلیمرائز کرنے والے زندگی کا امید نہیں دے سکتے۔ جو عمومی زندگی میں بھی جنگ کے اصول اپناتی ہو، قومیں ایسی قیادت کے ہاتھوں برباد ہو جاتی ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ ''دنیا'')

© rasailojaraid.com